پانچواں باب

اقامتِ دین کا طریقۂ کار

مقصد سے اصول کار کا فطری ربط:۔

جب یہ بات واضح ہو چکی کہ ہماری زندگی کا عملی نصب العین دین حق کی اقامت ہی ہے اور کوئی تاویل یا عذر اس کی ذمہ داری سے ہمیں کبھی سبکدوش نہیں کر سکتا، تو اب پوری سنجیدگی اور اہمیت سے اس بات پر غور کرنا چاہیے کہ اس نصب العین کے لیے جدوجہد کس طرح کی جائے؟ آیا اس کا کوئی مخصوص طریقہ کار ہے یا جس سمت سے چاہیں اس منزل مقصود کی طرف مارچ کر سکتے ہیں؟ جن لوگوں نے اجتماعیات کا سرسری مطالعہ بھی کیا ہوگا، وہ اس حقیقت سے ناواقف نہیں ہو سکتے کہ ہر جماعت کا، جو کسی مقصد کو لے کر اٹھی ہو، جس طرح ایک مخصوص مزاج اور ایک مخصوص انداز فکر ہوتا، اسی طرح اس کی تشکیل، تنظیم اور تعمیر کا بھی ایک مخصوص انداز ہوتا ہے۔ اس انداز فکر کی طرح اس انداز تعمیر کا تعین بھی وہی مقصد کرتا ہے۔ جس کو لے کر یہ جماعت اٹھی ہوتی ہے۔

اس اصولی حقیقت کو چند مثالوں سے اچھی طرح سمجھا جا سکتا ہے:۔

فرض کیجیے کہ آپ کو ایک قومی حکومت قائم کرنا ہے، اس مقصد کو حاصل کرنے کے لیے آپ کو جو کچھ کرنا ہوگا وہ یہ ہوگا کہ آپ پہلے تو اپنے افرادِ قوم کے دلوں کو وطنی سربلندی اور قومی اقتدار کے عشق سے معمور کریں، ان میں اپنے اوپر آپ حکمراں ہونے کا عقیدہ اور عزم پیدا کریں۔ پھر قومی آن پر نثار ہو جانے کے لیے ان کے اندر سرفروشی کی آگ بھڑکائیں، اور اپنے محبوب مقصد کو حاصل کرنے کے لیے انکی قوتوں کو ایک پلیٹ فارم پر جمع کر دیں۔ جب یہ سب آپ کر لیں تو بس سمجھ لیجیے کہ کامیابی کی تمام شرطیں آپ نے پوری کر لیں۔ اب آپ کو یہ دیکھنے کی قطعاً کوئی ضرورت نہیں کہ میرے جھنڈے کے نیچے جو لوگ جمع ہیں وہ توحید کے متعلق، رسالت

کے متعلق، قیامت اور جزائے عمل کے متعلق کیا خیال رکھتے ہیں؟ ان کے اندر دین کی پابندی کتنی ہے؟ انہوں نے سچائی، رحمدلی، پاک دامنی، خوش خلقی، اور خدا ترسی جیسے اوصاف سے اپنے کو کہاں تک آراستہ کر لیا ہے؟ ان میں سے کسی چیز کے بھی دیکھنے کی آپ کو حاجت نہیں۔ کیونکہ جو مقصد اور نصب العین آپ کے سامنے ہے، اس کے لیے یہ چیزیں سرے سے مطلوب ہی نہیں ہیں۔ بل کہ شاید کچھ مضر ہی ہوں۔ یہاں تو جو چیزیں مطلوب ہیں وہ صرف یہ ہیں کہ حریف طاقتوں سے اندھی دشمنی اور قوم سے اندھی محبت رکھئے اور اس دشمنی اور محبت میں سب کچھ کر گزریئے۔

اسی طرح اگر آپ ملک میں کمیونزم کا اقتدار اور کمیونسٹ نظام قائم کرنا چاہتے ہوں تو آپ کو پہلے وہاں کے باشندوں کے ذہن میں کمیونسٹ فلسفۂ زندگی، کمیونسٹ نظام معیشت و حکومت اور کمیونسٹ نظریۂ اخلاق کی "خوبیاں" اتارنی ہوں گی۔ سرمایہ پرستی ہی نہیں بل کہ سرمایہ داری کے بھی خلاف دلوں میں شدید نفرت پیدا کرنی ہو گی۔ مارکس اور لنین کے ساتھ وہ عقیدت پیدا کرنی ہو گی جو خدا اور پیغمبر کے لیے اہلِ مذہب کے دلوں میں ہوا کرتی ہے۔ اور خدا، رسول، آخرت، دین، اخلاق اور اعمال صالحہ کے الفاظ کو خود غرض سرمایہ پرستوں کے ہتھکنڈے قرار دے کر اور ان کے اثر کو ذہنوں سے مٹا کر خالص مادی تصور حیات اور حیوانی تصور کائنات ان پر ثبت کرنا ہو گا۔ پھر جب آپ یہ بنیاد جمالیں اور ایک بڑی تعداد میں لوگوں کو ان خیالات اور نظریات کا گرویدہ بنالیں تو ان کا ایک جتھ بنا کر ایک طرف باقی عوام کو اپنے پروپیگنڈہ کے زور سے مسحور کرنے کی جدو جہد جاری رکھیں، اور دوسری طرف خفیہ اور علانیہ تمام ممکن ذرائع سے موجودہ نظام حکومت کے تخت کو الٹنے کی مہم شروع کر دیں، تا آنکہ عوام کے ہاتھوں یہ تخت الٹ کر اشتراکی حکومت قائم ہو جائے۔

علیٰ ہٰذا القیاس اگر ایک شخص منظم طریقے پر رہزنی کرنا چاہتا ہو تو وہ ایسے لوگوں کو تلاش کرے گا جو مضبوط جسم، بے خوف دل اور خونخوار فطرت رکھتے ہوں۔ ایسے آدمی اس کے کسی کام کے نہ ہوں گے جو نرم دل ہوں اور غارت گری و خونریزی سے متنفر ہوں۔ جب ایسے لوگوں کو وہ حاصل کر لے گا تو اِن "ضروری اور کار آمد صفتوں" کا ان میں مزید استحکام پیدا کرنے کی تدبیریں کرے گا۔ لوٹ مار کے انہیں گُر سکھائے گا، اسلحے مہیا کرے گا۔ تب کہیں جا کر اپنی مہم کا آغاز کر سکے گا۔

غرض دنیا کی ہر با مقصد جماعت کا یہی حال ہے کہ وہ ہمیشہ ایسے ہی لوگوں کو اپنے اندر جگہ دیتی ہے جو اس کے پیش نظر مقصد سے فطری لگاؤ رکھتے ہوں اور لازماً ایسے ہی طریق کار اور ایسی

ہی پالیسیاں اختیار کرتی ہے جو اس مقصد کے مزاج سے پوری طرح ہم آہنگ ہوں۔ "امت مسلمہ" کہلانے والی جماعت اور قیام دین کا مقصد بھی اس کلیہ سے مستثنیٰ نہیں ہو سکتا۔ اس مقصد کے حصول کے لیے بھی ایک خاص طریقہ کار ہونا چاہیے آیئے دیکھیں وہ طریقِ کار کیا ہے؟

طریق کار کے مآخذ:

اس غرض سے جب ہماری نگاہ اٹھتی ہے تو قدر تاً وہ قرآن اور سنت ہی پر جا کر ٹھہرتی ہے کیونکہ جہاں سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ اقامتِ دین ہمارا فریضۂ حیات ہے، حق یہ ہے کہ اس فریضے کو ادا کرنے کے اصولِ کار بھی وہیں سے ملیں۔ کیا قرآن اور سنت نے ہماری اس ضرورت کو محسوس کیا ہے؟ اس سوال کا جواب ہر حیثیت سے مکمل اثبات میں ہے۔ اسلام سے تھوڑی بہت واقفیت رکھنے والا بھی اچھی طرح جانتا ہے کہ قرآن اور صاحبِ قرآن نے جس طرح امت مسلمہ کا مقصد وجود بالکل وضاحت سے بیان کر دیا ہے اسی طرح اس کے طریق کار کے بارے میں بھی انہوں نے کوئی حجاب باقی نہیں رہنے دیا ہے۔ چنانچہ ہر اُس آنکھ کو جو اندھی نہ ہو، قرآن اور سنت کے صفحوں میں یہ طریق کار اسی طرح نمایاں اور روشن دکھائی دے سکتا ہے جس طرح اندھیری راتوں میں آسمان کے سینے پر جگمگاتی کہکشاں۔ قرآن، قرآن کے طریق نزول، اور صاحب قرآن کے اُسوے، تینوں سے اس طریق کار کی کھلی کھلی نشان دہی ہوتی ہے، جو کہنے میں تو تین الگ الگ وجود ہیں مگر زیر بحث مقصد کے اعتبار سے تینوں دراصل ایک ہی ہیں۔ قرآن کے نصوص کو چوں کہ اس معاملہ میں بنیاد کی حیثیت حاصل ہے اور باقی دو چیزیں اسی کے توابع اور لوازم کا درجہ رکھتی ہیں اس لیے اقامتِ دین کے اصول و طریق کار کی بنیادی وضاحت بھی ہمیں اسی سے لینی چاہیے۔

اقامتِ دین کے قرآنی اصول:

قرآن کریم کو غور سے پڑھیے، تو وہ اصول و نکات بڑی آسانی کے ساتھ ہاتھ آجاتے ہیں، جن کے مطابق اقامتِ دین کی جدوجہد کی جانی چاہیے۔ بل کہ حقیقت تو یہ ہے کہ ان اصولوں کی تفصیل سے پورا قرآن بھرا ہوا ہے، اور یہ ایک ایسی بات ہے جو توقع کے عین مطابق ہے۔ کیونکہ جب اس کے مباحث کا اصل مرکز یہی اقامتِ دین ہے تو قدرتی طور پر اس کی ساری تفصیلات بلاواسطہ یا بالواسطہ اسی کے اصول و ذرائع کی شرح و تفصیل ہی ہوں گی۔ لیکن چوں کہ

قرآن اپنے مدعا کو انسانی ذہن میں پوری طرح بٹھا دینے اور اچھی طرح محفوظ کر دینے کے لیے کوئی ضروری تدبیر اٹھا نہیں رکھتا اور جہاں تک اقامت دین کے مسئلے کا تعلق ہے، وہ اس کا سب سے اہم اور بنیادی مسئلہ تھا، اس لیے اس کے طریق کار کو اس نے جہاں سینکڑوں صفحات میں پھیلا کر بیان کیا ہے اور مختلف جگہوں میں اس کے مختلف پہلوؤں پر روشنی ڈالی ہے وہاں بعض مقامات پر اس نے انہیں اکٹھے سمیٹ کر بھی بیان کیا ہے، تاکہ چند جملوں کے مختصر سے آئینے میں ان کی پوری تصویر بیک نظر بھی دیکھی جا سکے۔ اس طرح کے "جوامع الکلم" میں سب سے زیادہ جامع اور ساتھ ہی سب سے زیادہ واضح آیتیں یہ ہیں:۔

يٰاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ حَقَّ تُقَاتِهٖ وَلَا تَمُوْتُنَّ اِلَّا وَاَنْتُمْ مُّسْلِمُوْنَ

(آل عمران: ۱۰۲)

اے ایمان والو! اللہ کا ٹھیک ٹھیک تقویٰ اختیار کرو اور دنیا سے نہ رخصت ہو مگر اس حال میں کہ تم "مسلم ہو"

وَاعْتَصِمُوْا بِحَبْلِ اللّٰهِ جَمِيْعًا وَّلَا تَفَرَّقُوْا وَاذْكُرُوْا نِعْمَةَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ اِذْ كُنْتُمْ اَعْدَآءً فَاَلَّفَ بَيْنَ قُلُوْبِكُمْ فَاَصْبَحْتُمْ بِنِعْمَتِهٖٓ اِخْوَانًا وَلْتَكُنْ مِّنْكُمْ اُمَّةٌ يَّدْعُوْنَ اِلَى الْخَيْرِ وَيَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ وَلَا تَكُوْنُوْا كَالَّذِيْنَ تَفَرَّقُوْا وَاخْتَلَفُوْا مِنْۢ بَعْدِ مَا جَآءَهُمُ الْبَيِّنٰتُ.

(آل عمران: ۱۰۳۔۱۰۵)

اور تم سب مل کر اللہ کی رسی کو مضبوط پکڑ لو اور ٹولی ٹولی نہ ہو رہو۔ اللہ کے اس احسان کو یاد رکھو جو تم پر ہوا ہے، جب تم ایک دوسرے کے دشمن تھے تو اس نے تمہارے دل باہم جوڑ دیے اور اس کے فضل و کرم سے تم بھائی بھائی ہو گئے۔ اور چاہیے کہ تم وہ گروہ بنو جو لوگوں کو بھلائی کی طرف بلائے، نیکی کا حکم دے، بدی سے روکتا رہے، ایسے ہی لوگ فلاح پانے والے ہیں اور (دیکھو) کہیں تم ان لوگوں کی طرح نہ ہو جانا جو واضح ہدایتیں پانے کے باوجود ٹولیوں میں بٹ گئے اور اختلاف میں مبتلا ہو گئے۔

یہ آیتیں مدینہ کی ابتدائی زندگی، یعنی ۳ ہجری میں نازل ہوئی تھیں۔ یہ وہ زمانہ ہے جب امت مسلمہ کی اجتماعی اور سیاسی زندگی تاسیس و تعمیر کے ابتدائی مرحلوں سے گذر رہی تھی۔ عین اس زمانے میں یہ آیت کریمہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے اقامتِ دین اور نظام مومنین کا ایک مختصر مگر

جامع ربانی پروگرام لے کر آئیں۔ جس میں اقامتِ دین کے طریق کار کے نہ صرف عملی اصول ہی بتادیے گئے بل کہ یہ بھی واضح فرمادیا گیا کہ ان اصولوں میں باہم ترتیب کار کیا ہونی چاہیے؟ نیز یہ بات بھی کہ اس نصب العین کی خاطر کی جانے والی جدوجہد کن تدریجی مرحلوں سے گذرتی ہوئی اپنی غایتِ مقصود تک پہونچا کرتی ہے۔ اس ربانی پروگرام پر غور کیجیے تو وہ تین اجزا یا اصولی نکات پر مشتمل دکھائی دے گا:۔

(۱) تقویٰ کا التزام (۲) مضبوط و منظم اجتماعیت (۳) امر بالمعروف و نہی عن المنکر۔

یہی تین نکات ہیں جو اقامتِ دین کے بنیادی اصول کار ہیں۔ ان کو تفصیل کی روشنی میں دیکھیے:۔

(۱) تقویٰ کا التزام:

اقامت دین کے لیے سب سے پہلے جس چیز کی ضرورت ہے اور جس کو اس راہ کی "شرط اول قدم" کہنا چاہیے۔ وہ اِتَّقُوْ اللّٰہَ حَقَّ تُقَاتِہٖ وَلَاتَمُوْتُنَّ اِلاَّ وَاَنْتُمْ مُسْلِمُوْنَ کے فرمان خداوندی میں مذکور ہے، جس کا مطلب یہ ہے کہ ہر وہ شخص جو اپنے کو "ایمان والا" سمجھتا ہو، اور جو اس ایمان کی عائد کی ہوئی ذمہ داری سے عہدہ برآ ہونا چاہتا ہو، اس کے لیے لازم ہے کہ اللہ کا "تقویٰ" اختیار کرے اور اپنے آخری سانس تک ہر آن اور ہر لحہ ایک "مسلم" بن کر زندگی بسر کرے۔ تقویٰ کا پورا عملی مفہوم جو قرآن کی زبان سے بیان ہوا ہے اس سے شمہ برابر بھی کم نہیں کہ اللہ کے تمام حکموں کا ٹھیک ٹھیک اتباع کیا جائے، اس کے کسی امر کو چھوڑ دینے سے بھی ڈرا جائے، اور اس کی کسی نہی کے کر گذرنے سے بھی خوف کھایا جائے۔ اسی طرح مسلم کے معنی بھی قرآنی بیانات کی روشنی میں سچے فرماں بردار اور مخلص اطاعت شعار کے ہیں۔ یعنی مسلم وہ شخص ہے جس نے احکامِ خداوندی کے سامنے اپنی گردن رضا کارانہ جھکا دی ہو۔ اس لیے ان دونوں اصطلاحوں کے مفہوموں کے پیش نظر اقامتِ دین کے پروگرام کا پہلا جزو، یا اصول یہ ہوا کہ ہر مسلمان سب سے پہلے خود اپنے اوپر اللہ کے دین کو قائم کرے۔ خوف ورجا کی ساری نیاز مندیاں بس اسی ایک ذات کے لیے مخصوص کردے۔ تعظیم و تذلل اور سرفگندی کے تمام جذبات اسی کی رضا جوئی کے لیے وقف کردے۔ تمام اطاعتوں سے منھ موڑ کر بس اسی ایک آقا کی اطاعت کا حلقہ اپنی گردن میں ڈال لے۔ اپنے نفس کو ان تمام امور سے پاک کرے جو اس کی ناخوشی کا سبب بنتے ہیں اور ان تمام صفات سے اسے آراستہ کرے جو اس کی رضا کے باعث ہوتے ہیں۔ اپنے کو اللہ تعالیٰ کا ہمہ وقتی غلام سمجھتا رہے اور اس کے کسی حکم کی بجا آوری میں نہ تولیت و لعل کرے اور نہ دل تنگ ہو۔

اپنی نگاہ کو حق تعالیٰ کی رضا طلبی اور حکم برداری پر پوری طرح جمائے رہے۔ خواہ کتنی ہی مخالفتیں، مصیبتیں، ناسازگاریاں اور دل شکنیاں اس کی راہ میں کیوں نہ حائل ہوں۔ کیونکہ یہ چیزیں اگرچہ بظاہر مشکلات و مصائب ہی ہیں، مگر فی الواقع یہ اتباع حق اور التزام تقویٰ کی ضروری آزمائشی منزلیں ہیں، جن سے گذرے بغیر کسی مدعیٔ ایمان کا اور تقویٰ خدا کے ہاں سندِ اعتبار اور شرفِ قبول نہیں حاصل کرتا۔ جیسا کہ قرآن کا فرمانا ہے۔

وَلَنَبْلُوَنَّكُمْ بِشَيْءٍ مِّنَ الْخَوْفِ وَالْجُوْعِ وَنَقْصٍ مِّنَ الْاَمْوَالِ وَالْاَنْفُسِ وَالثَّمَرَاتِ وَبَشِّرِ الصَّابِرِيْنَ (البقرۃ:۱۵۵)

اَحَسِبَ النَّاسُ اَنْ يُّتْرَكُوْا اَنْ يَّقُوْلُوْا اٰمَنَّا وَهُمْ لَا يُفْتَنُوْنَ وَلَقَدْ فَتَنَّا الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ فَلَيَعْلَمَنَّ اللّٰهُ الَّذِيْنَ صَدَقُوْا وَلَيَعْلَمَنَّ الْكَاذِبِيْنَ.

(العنکبوت:۲۔۳)

ہم تم کو (یعنی تمہارے ادعائے ایمان کو) خطروں اور فاقوں اور تمہارے مال اور جان اور پیداوار کے نقصانوں کے ذریعہ ضرور آزمائیں گے۔ اور اے نبیؐ ان لوگوں کو (کامرانی کا) مژدہ سنا دو (جو ان خطرات و نقصانات کو) صبر و ضبط کیساتھ برداشت کرلیں۔ کیا لوگوں نے یہ گمان کر رکھا ہے کہ وہ بس اتنا کہہ دینے پر چھوڑ دیے جائیں گے کہ ہم ایمان لائے اور نہیں پرکھا نہ جائیگا حالانکہ (یہ پرکھنا ہماری ہمیشہ کی سنت ہے) اور ہم نے ان سے پہلے بھی لوگوں کو پرکھا ہے لہذا تمہیں بھی اللہ تعالیٰ یہ ضرور دیکھے گا کہ تم میں سے کون سچے (مومن) ہیں اور کون جھوٹے۔

اس لیے ان چیزوں سے گھبرانے اور کترانے کے بجائے ان کا صبر اور اطمینان کے ساتھ مقابلہ کرنا چاہیے۔ ورنہ وہ دل ایمان کا لذت شناس نہیں ہو سکتا جو ان رکاوٹوں کے آگے سپر ڈال دے، اور نہ وہ سینہ تقویٰ کے نور سے بہرہ یاب ہو سکتا ہے، جو اس آزمائش کی ہمت نہ رکھے۔ اپنے ایمان واسلام کے متعلق بڑے دھوکے میں ہو گا وہ شخص جو حدود اللہ کی پاسداری اور احکام قرآنی کی پیروی میں اپنے نام نہاد جانی اور مالی، گروہی اور طبقاتی، قومی اور وطنی مفادات کا بچاؤ پہلے کر لینے کی فکر کرے، اور اتباعِ حق کو جان و مال کی کامل محفوظیت کے ساتھ مشروط رکھے۔۔۔ ایسے شخص کی زبان پر اسلام، اور اس کی شکل و صورت میں تقویٰ تو ہو سکتا ہے، مگر اس کا باطن ان طائرانِ قدس کا آشیانہ نہیں ہو سکتا۔ غرض اہل ایمان کی آزمائش اللہ تعالیٰ کی ایک عام سنت ہے۔ اور اسی سنت کو

پورا کرنے کے لیے اس نے اسلام اور اتقاء کا راستہ مشکلات اور مصائب کی چٹانوں سے بھر رکھا ہے۔ اس لیے جو شخص اِتَّقُوا اللّٰہَ حَقَّ تُقَاتِہٖ کے فرمانِ الٰہی کی تعمیل کرنا چاہتا ہو، اس کو ان چٹانوں سے ٹکرانا اور ان کی ٹھوکریں برداشت کرنا ناگزیر ہے۔

(۲) منظّم اجتماعیت:

اس پروگرام کی دوسری دفعہ یا دوسرا نکتہ وَاعْتَصِمُوْا بِحَبْلِ اللّٰہِ جَمِیْعًا وَّلَا تَفَرَّقُوْا کے الفاظ میں بیان ہوا ہے، ان لفظوں میں جس چیز کا حکم دیا گیا ہے وہ دو باتوں پر مشتمل ہے: ایک تو یہ کہ وہ تمام اہلِ ایمان جو احکام الٰہی و حدود خداوندی کی پابندی میں سرگرم اور اپنی انفرادی اصلاح و تزکیہ میں کوشاں ہوں مل کر ایک مضبوط و منظّم جماعت بن جائیں۔ اور یہ پوری جماعت ایک ہی جسم کے اعضاء کی طرح باہم جڑی ہوئی ہو۔ دوسری یہ کہ اسے اس طرح باہم جوڑ کر رکھنے والی چیز نہ کوئی نسلی رشتہ ہو نہ کوئی وطنی تعلق، نہ کوئی معاشی یا سیاسی مفاد ہو نہ کوئی دنیوی اور مادّی مقصد، بل کہ صرف "اللہ کی رسی" یعنی اس کی بندگی کا وہ عہد ہو جو، ہر مسلمان نے کر رکھا ہے، وہ قرآن ہو جس کی پیروی ہی کسی شخص کو مومن بناتی ہے، وہ دین ہو جس کی اطاعت و اقامت ہی کے لیے امتِ مسلمہ وجود میں لائی گئی ہے۔ غرض جس طرح ملت کا منظّم اور متحد رہنا ایک ضروری چیز ہے۔ اسی طرح یہ بات بھی ضروری ہے کہ اس نظم و اتحاد کا شیرازہ صرف "یہ حبل اللہ" ہی ہو۔ بل کہ اگر ذرا گہری نظر سے دیکھا جائے تو یہ بات اس سے بھی کہیں زیادہ اہم نظر آئے گی، اتنی زیادہ اہم کہ مجبوری کی بعض ایسی حالتیں تو ہو سکتی ہیں، جن میں اتحاد و تنظیم سے محروم ہو کر بھی مومن خدا کے حضور معذور اور بری قرار پا جائے گا، مگر جو چیز اس اتحاد و تنظیم کا شیرازہ ہے اسے کسی حالت میں بھی اگر چھوڑ دیا گیا تو اس کی باز پرس سے چھٹکارا ہرگز نہ ہو سکے گا۔ اس لیے یہ غلط فہمی نہ ہونی چاہیے کہ اسلام کے نزدیک نفس اتحاد ہی کوئی مطلوب و محبوب چیز ہے خواہ وہ کسی غرض کے لیے اور کسی مقصد پر مبنی کیوں نہ ہو۔ اس کے بخلاف حقیقت یہ ہے کہ اگر اتحاد کی بنیاد کسی فاسد مقصد پر رکھی گئی ہو تو نہ صرف یہ کہ وہ اسلام کا مطلوب نہیں بل کہ اس کی نظروں میں حد درجہ مردود اور مبغوض ہے، اور اُس اتحاد سے بال برابر بھی مختلف نہیں جو چوروں اور ڈاکوؤں کے مابین ہوا کرتا ہے۔ اسلام کا مطالبہ صرف اس اتحاد کا ہے جس کا شیرازہ اتباع حق اور اقامتِ حق ہو۔

اقامتِ دین کا یہ نکتہ، یعنی جماعتی اتحاد، اگر ذرا غور کیجیے تو پہلے نکتہ سے کوئی بالکل الگ اور بے تعلق چیز نہیں ہے بل کہ اسی کا ایک فطری تقاضا ہے۔ ایک طالب علم کو اس کی اپنی طبیعت

ہی مجبور کرتی ہے کہ اپنے ساتھی طلبہ سے بے تکلفی، دل بستگی اور الفت و محبت رکھے۔ ایک تعلیم یافتہ اور علم دوست کے مذاق اور مزاج ہی کا یہ مطالبہ ہوتا ہے کہ ارباب علم و دانش کی ہم نشینی اختیار کرے۔ ایک رنگین طبع اپنے جیسے رنگین مزاجوں کی طرف خود بخود کھنچ اٹھنے سے رُک نہیں سکتا۔ اور اگر کسی طالب علم کو اپنے ساتھیوں سے کسی صاحب علم کو اہل علم و فضل سے، کسی رنگین مزاج کو اہل نشاط سے گہری وابستگی نہ ہو تو یقین کرنا چاہیے کہ وہ صحیح معنوں میں طالب علم اور صاحب علم اور رنگین طبع نہیں۔ ہم مشربی کی یہی وہ کشش ہے جس کو عام اصطلاح میں جاذبہ ٔ جنسیت، کہا جاتا ہے۔ اصولاً اس جاذبہ ٔ جنسیت کو اہل تقویٰ کے درمیان بھی اپنا کام کرنا چاہیے اور وہ کرتا بھی ہے۔ ایک وہ انسان جو خدا پرستی کے جذبات سے سرشار ہو ان لوگوں کی طرف لازماً کھنچتا ہے، جو اسی کی طرح اتباعِ حق اور تقویٰ کے لذت شناس ہوں۔ یہ ممکن نہیں کہ دو دلوں میں خدا کا حقیقی تقویٰ موجود ہو اور اس کے باوجود وہ آپس میں کٹے ہوئے یا ایک دوسرے سے بے تعلق ہوں۔ اس کے بہ خلاف ان میں جذب و انجذاب لازمی ہے۔ اور اگر ایسا نہ ہو تو سمجھنا چاہیے کہ تقویٰ کی صورت میں اندر کوئی دوسری ہی روح پرورش پا رہی ہے کیونکہ ایک ہی منزل اور ایک ہی راہ کے دو مسافر ایک دوسرے کے غیر بن کر نہیں رہ سکتے۔ یہی وجہ ہے، جو آپ دیکھتے ہیں کہ مسلمانوں کی تعریف اگر کہیں اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ اِخْوَةٌ اور بَعْضُهُمْ اَوْلِيَآءُ بَعْضٍ کے الفاظ سے کی گئی ہے تو کہیں رُحَمَآءُ بَيْنَهُمْ اور اَذِلَّةٍ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ ان کا نشانِ امتیاز ٹھیرایا گیا ہے۔ گویا اسلام کے پیروؤں کا باہم جڑ کر رہنا ان کے ایمان اور اتقا کی کسوٹی ہے۔ قرآن کی نگاہ میں اہل ایمان کے لیے اس وصف کا وجود کتنی اہمیت رکھتا ہے۔ اس چیز کا اندازہ کرنے کے لیے ضروری ہے کہ اس کی بعض اُن ہدایات پر بھی نظر ڈال لی جائے جو اس معاملے کے منفی پہلو سے تعلق رکھتی ہیں ان میں سے ایک ہدایت یہ ہے:

> يٰاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَتَّخِذُوْٓا اٰبَآءَكُمْ وَاِخْوَانَكُمْ اَوْلِيَآءَ اِنِ اسْتَحَبُّوا الْكُفْرَ عَلَى الْاِيْمَانِ وَمَنْ يَّتَوَلَّهُمْ مِّنْكُمْ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الظّٰلِمُوْنَ (التوبۃ: ۲۳)
>
> اے ایمان لانے والو! اگر تمہارے باپ اور بھائی ایمان کے مقابلے میں کفر کو ترجیح دیں تو ان کو اپنا ولی (قلبی رفیق) نہ بناؤ اور جو لوگ ان کو اپنا ولی بنائیں گے تو وہی ظالم ہوں گے۔

معلوم ہوا کہ جس طرح ایک سچا مومن اور متقی دوسرے مومنوں سے بے تکلفی نہیں رکھ سکتا خواہ نسلی اور خواہ قومی لحاظ سے وہ اس کے بیگانے ہی کیوں نہ ہوں، اسی طرح وہ فساق و فجار سے قلبی

رابطہ بھی نہیں رکھ سکتا خواہ وہ اس کے قریب ترین عزیز ہی کیوں نہ ہوں۔ قرآن اس کے امکان کو بھی تسلیم کرنے کے لیے تیار نہیں ہے، جیسا کہ اسی ضمن کی ایک اوز آیت صراحت کرتی ہے:۔

لَا تَجِدُ قَوْماً یُّؤْمِنُوْنَ بِاللّٰہِ وَالْیَوْمِ الْاٰخِرِ یُوَآدُّوْنَ مَنْ حَآدَّ اللّٰہَ وَرَسُوْلَہٗ وَلَوْ کَانُوْآ اٰبَآءَ ھُمْ اَوْ اَبْنَاءَ ھُمْ اَوْ اِخْوَانَھُمْ اَوْعَشِیْرَتَھُمْ (المجادلۃ: ۲۳)

تم کسی ایسے گروہ کو، جو اللہ اور یوم آخرت پر ایمان رکھتا ہو، ان لوگوں سے الفت و مودت کا رشتہ رکھتا ہوا نہ پاؤ گے جو اللہ اور اس کے رسول کی عداوت اور مخالفت پر کمر بستہ ہوں خواہ وہ اس کے اپنے ہی باپ یا بیٹے یا بھائی یا اہلِ خاندان کیوں نہ ہوں۔

ان راشادات سے یہ حقیقت پوری طرح روشن ہو جاتی ہے کہ ایمان کے رشتے کو انسانی تعلقات میں فیصلہ کن حیثیت حاصل ہے۔ وہ ایک طرف تو مختلف نسلوں اور قوموں کے افراد کو باہم بھائی بھائی بنا کر جوڑ دیتا ہے۔ دوسری طرف اس کی زبردست قوت تمام مادی رشتوں کو بے جان اور غیر مؤثر بنا کر رکھ دیتی ہے۔ گویا یہ ایک سورج ہے جس کے آگے تمام ستارے بے نور ہو کر رہ جاتے ہیں پھر ایمان کا یہ منفی اثر وعمل اس کے مثبت اثر وعمل کو مزید طاقت بھی دے دیتا ہے اور اہل ایمان کے مابین قائم ہونے والے اتحاد کو اور زیادہ مستحکم بنا دیتا ہے۔

غرض ایک نصب العین کی علمبردار اور ایک اصول کی پیرو دوسری جماعتیں جس حد تک اپنے ارکان کو ڈسپلن کی مضبوط بندشوں میں باندھ کر رکھتی ہیں" اللہ کا دین اپنے پیرووں کو اس سے بھی زیادہ مضبوطی سے جڑ جانے کی زبردست ہدایت کرتا ہے۔ انتشار واختلاف کو وہ انتہائی مذموم ٹھہراتا ہے اور دین حق کے مزاج کے اسے یکسر خلاف قرار دیتا ہے۔ حد یہ ہے کہ ایک پیغمبر (حضرت ہارون علیہ السلام) نے اپنی قوم کی اکثریت کو علانیہ بت پرستی میں مبتلا ہو جاتے دیکھا مگر انہیں صرف سمجھانے بجھانے ہی پر اکتفا کیا، اور ان کے خلاف کوئی فوری قدم اٹھانے سے محض اس لیے احتراز کر گئے کہ کہیں قوم کی جمعیت پراگندہ نہ ہو جائے۔ اور جب حضرت موسیٰ علیہ السلام نے سینا کی پہاڑی سے واپس آکر ان سے اس سلسلے میں سختی سے باز پرس کی تو انہوں نے عذر پیش کرتے ہوئے کہا کہ خَشِیْتُ اَنْ تَقُوْلَ فَرَّقْتَ بَیْنَ بَنِیْ اِسْرَائِیْلَ۔ (میں اس بات سے ڈرا کہ آپ کہیں گے تم نے بنی اسرائیل میں پھوٹ ڈال دی)

(۳) امر بالمعروف ونہی عن المنکر:

اقامت دین کے پروگرام کی تیسری بنیاد وَلْتَکُنْ مِّنْکُمْ اُمَّۃٌ یَّدْعُوْنَ اِلَی الْخَیْرِ وَیَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَیَنْھَوْنَ عَنِ الْمُنْکَرِ کے ارشاد میں واضح کی گئی ہے۔ جس کی تفصیل یہ

ہے کہ انفرادی حیثیت سے اپنی اپنی ذات کے اوپر دین حق کا قائم کر لینا اور پھر ایسے تمام افراد کا باہم جڑ کر ایک جماعت بن جانا ہی کافی نہیں ہے، بل کہ ان دونوں باتوں کے ساتھ یہ بھی ضروری ہے کہ اُس "خیر اور معروف" کی طرف دوسروں کو بھی بلایا جائے جس کو خود قبول کیا گیا ہے، اور اس "منکر" کو اپنے مقدور بھر مٹا ڈالنے کی مسلسل کوشش جاری رکھی جائے جس کو خود ترک کیا گیا ہے۔ یہاں تک کہ خدا کی زمین کے کسی گوشہ میں اس کے دین کے سوا کسی اور دین کا اقتدار باقی نہ رہ جائے۔

جس طرح اقامتِ دین کے عملی پروگرام کی دوسری دفعہ (افراد امت کا منظم اتحاد) پہلی دفعہ (انفرادی صلاح و تقویٰ) کا لازمی تقاضا ہے اسی طرح یہ تیسری دفعہ (امر بالعروف و نہی عن المنکر) بھی اس کا فطری مقتضا ہے، نہ کہ کوئی ایسا مستقل بالذات حکم جو اس سے کسی طرح کی مزاجی مناسبت رکھتا ہی نہ ہو۔ یہ بات کہ امر بالمعروف کس طرح ایمان اور تقویٰ کی فطری طلب ہے، ایمان اور تقویٰ کی حقیقتوں پر غور کرنے سے بآسانی واضح ہو جاتی ہے۔ ایمان اور تقویٰ کی حقیقی روح کیا ہے؟ صرف اللہ تعالیٰ کی محبت بھری تعظیم کوئی محبت بھری تعظیم۔ محبوب کی مرضیات کے بارے میں کیا چاہے گی؟ صرف یہ کہ گرد و پیش انہی کی کار فرمائی ہو، ورنہ اس دل کو سوز محبت سے آشنا کون کہہ سکتا ہے جو محبوب کی مرضی کو پامال ہوتا ہوا دیکھ کر تڑپ نہ اٹھے؟ اس لیے خدا کی محبت اور حق کی جاذبیت ایک خدا پرست کو چین سے ہر گز بیٹھنے نہیں دے سکتی، جب تک صفحۂ ارض پر اس کی نگاہوں میں چبھنے کے لیے ایک باطل اور کھٹکنے کے لیے ایک منکر بھی موجود ہو۔ یہ بات اس کے اسلام اور ایمان کے یکسر منافی ہے کہ کسی شخص یا گروہ یا ملک کو وہ دین اللہ کے حلقۂ انقیاد سے آزاد اور طاغوت کا فرماں بردار دیکھے اور ٹھنڈے دل سے اسے برداشت کر لے۔ لہٰذا اقامتِ دین کا فریضہ ادا نہیں ہو سکتا اگر پیروان اسلام کی جمعیت امر بالمعروف سے غافل ہو۔ اور اِتَّقُوا اللّٰهَ حَقَّ تُقَاتِهٖ وَلَا تَمُوْتُنَّ اِلَّا وَاَنْتُمْ مُسْلِمُوْنَ کا حکم تشنۂ تعمیل ہی رہ جائے گا اگر اہل ایمان بس اپنی ذات ہی تک احکام الٰہی کی پیروی کو کافی سمجھ لیں اور ان کو اس سے کوئی غرض نہ ہو کہ باقی دنیا کدھر جا رہی ہے۔

اس کے علاوہ امر بالمعروف مومن اور مسلم اور متقی ہونے کے فطری تقاضوں میں ایک اور پہلو سے بھی داخل ہے، اور وہ ہے اللہ کے بندوں سے اخوت، محبت اور خیر خواہی کا پہلو۔ جو شخص اسلام کو جانتا ہے وہ یہ بات بھی جانتا ہو گا کہ خدا سے محبت کرنے کا حق اس وقت تک ہر گز ادا نہیں ہو سکتا جب تک کہ اس کی مخلوق سے بھی محبت نہ رکھی جائے، اس مخلوق سے جسے اس کے رسول نے اس کی "عیال" کہا ہے (اَلْخَلْقُ عَیَالُ اللّٰهِ (بیهقی) اور جس کی بہی خواہی کو ایمان کی

نشانی ٹھہرایا ہے (لَا یُؤْمِنُ اَحَدُکُمْ حَتّٰی یُحِبَّ لِاَخِیْہِ مَا یُحِبُّ لِنَفْسِہٖ ۔ مسلم) نوعِ انسانی کے ساتھ بہی خواہی کی شکلیں بہت سی ہیں مگر اس سے بڑی اُس کی اور کوئی بہی خواہی نہیں کہ اسے ان راستوں سے بچایا جائے جو گمراہی اور ابدی ہلاکت کے راستے ہیں اور جن پر چل کر انسان کی دنیا بھی عذاب بن جاتی ہے، اور آخرت بھی۔ اس لیے ایک مومن اگر اپنے دوسرے ابنائے جنس کو "منکرات" سے روکنے اور خیر و معروف کی طرف لانے کی کوشش کرتا ہے تو یہ دراصل کسی خارجی سبب کے تحت نہیں کرتا، بل کہ اپنے اس جذبۂ خیر خواہی کے تحت کرتا ہے جو اس کے ایمان کا پیدا کیا ہوا ہوتا ہے۔ جس طرح اس کا ایمان اسے اس بات پر ابھارتا رہتا ہے کہ بھوکوں کو کھانا کھلائے، ننگوں کو کپڑے پہنائے اور کمزوروں اور بیکسوں کی مدد کرے، اسی طرح، مگر اس سے کہیں زیادہ شدت کے ساتھ، وہ اسے اس بات کے لیے بھی بے چین رکھتا ہے کہ حق سے محروم بندگانِ خدا کو اس خزانۂ سعادت کی کنجیاں مہیا کردے جس کے پالینے کے بعد پھر کبھی وہ نہ بھوکے ہوں گے، نہ ننگے (اَنْ لَّا تَجُوْعَ فِیْھَا وَلَا تَعْرٰی) نہ انہیں اپنے مستقبل کا کوئی اندیشہ لاحق ہوگا نہ اپنے ماضی اور حال کا کوئی غم (لَا خَوْفٌ عَلَیْھِمْ وَلَا ھُمْ یَحْزَنُوْنَ) اس کی ایمانی فکر و نظر اسے بتاتی رہتی ہے کہ دوسرے انسانوں کے ساتھ اگر یہ بنیادی اور مقدم ترین خیر خواہی نہ کی گئی تو باقی ساری ہمدردیاں اور خیر خواہیاں بالکل ہیچ ہیں، اور ان سے خدا کے بندوں کے حقوق ہرگز ادا نہ ہوں گے اور خدا کے بندوں کے حقوق کا ادا نہ ہونا خود اس کے حقوق سے عہدہ برآنہ ہونے کی دلیل ہے۔

ایمان، اسلام اور تقویٰ سے امر بالمعروف کے یہ دو داخلی اور فطری تعلق تھے۔ ان کے علاوہ ان سے اس کا ایک خارجی اور مصلحتی تعلق بھی ہے، جسے ہم دعوتِ اسلامی کا سیاسی مفاد کہہ سکتے ہیں یعنی امر بالمعروف ایمان و اسلام کا فطری مطالبہ ہونے کے ساتھ ساتھ ان کی ایک سیاسی ضرورت بھی ہے اور وہ یہ کہ دعوتِ اسلامی کا علمبردار گروہ امر بالمعروف کا فریضہ بجالا کر ہی اپنے ایمانی جوہر کو پوری طرح برقرار رکھ سکتا اور اپنے مقصد کے حصول میں پوری طرح کامیاب ہوسکتا ہے اس کے مختلف وجوہ ہیں۔

(۱) اقامتِ دین کی عملی جدوجہد لازماً حق و باطل کی ایک طویل اور شدید جنگ کا دوسرا نام ہے۔ مقابلوں اور لڑائیوں کے متعلق فطرت کا یہ ایک اٹل قانون ہے کہ وہی فریق کامیاب ہوتا ہے جو اقدام کی عملی جرأت رکھتا ہو۔ بقا اور ارتقاء صرف پیش قدمی میں ہے۔ زبردست سے زبردست فوج بھی اپنے آپ کو شکست کی ذلت سے نہیں بچا سکتی اگر وہ دشمن سے مقابلے کے وقت اس پر آگے بڑھ کر حملے کرنا نہ جانتی ہو اسی طرح کوئی تحریک بھی زوال و انحطاط کا شکار ہونے سے نہیں بچ سکتی اگر وہ صرف اپنی داخلی تعمیر و تنظیم ہی میں مصروف رہے اور اپنے بیرونی ماحول کی تسخیر کی

مہم سے غافل ہو۔ اس لیے وہ جماعت جو اللہ کا دین قائم کرنے کے لیے کوشاں ہو اس وقت تک کامیابی کی مستحق نہیں ہو سکتی جب تک کہ وہ طاغوتی مورچوں پر مسلسل حملے نہ کرتی رہے۔ اور وہ اسلحہ جس سے یہ حملے کئے جا سکتے ہیں صرف امر بامعروف و نہی عن المنکر کا اسلحہ ہے۔

(۲) جس طرح ایک جاندار کا جسم مختلف وجوہ سے کچھ نہ کچھ برابر تحلیل ہوتا رہتا ہے اور اسے اپنی اصل طاقت غریزی کو بحال رکھنے کے لیے غذاؤں کی ضرورت پڑتی رہتی ہے، تاکہ وہ اس کی رگوں میں تازہ خون پہونچا کر اس کی زائل شدہ قوت کو واپس لاتی رہیں، اسی طرح اقامتِ دین کی جدوجہد میں مصروف گروہ کو بھی ایسے مختلف اسباب اور حالات سے سابقہ پیش آتا رہتا ہے جو اس کی توانائی کو متاثر کر دیا کرتے ہیں۔ اس لیے اسے بھی اس بات کی ضرورت ہوتی ہے کہ اس کے ایمان کو قوت بخش غذائیں دی جائیں، جو اس کے اندر خدا پرستی کی توانائیاں تازہ بتازہ داخل کرتی رہیں، تاکہ وہ برابر چست رہے، فعال رہے اور ترقی کرتا رہے۔ ورنہ رفتہ رفتہ اس کی قوت مرجھاتی چلی جائے گی، اور خود اس کے اپنے اوپر سے بھی دین کا اقتدار ڈھیلا ہوتا چلا جائے گا۔ ان "قوت بخش غذاؤں" میں سے جن سے یہ ایمانی توانائیاں حاصل ہوتی ہیں۔ "امر بالمعروف و نہی عن المنکر" بھی ایک بہترین "غذا" ہے۔

(۳) یہ کائنات اور اس کی ہر شے طبعاً متحرک پیدا کی گئی ہے، ٹھہراؤ سے اس کی فطرت نا آشنا ہے۔ اس لیے وہ کسی ایک حالت پر رکی نہیں رہ سکتی۔ بل کہ ضروری ہے کہ کسی نہ کسی سمت حرکت کرتی رہے۔ اسے اگر آگے بڑھنے کا موقع نہ ملے گا تو لازماً پیچھے ہی ہٹنے لگے گی۔ یہی "قانونِ حرکت" قیام دین کے بارے میں بھی کام کرتا ہے۔ اس کو ایک زندہ اور فاتح تحریک کی شکل میں برابر آگے بڑھتے رہنا چاہیے۔ ورنہ جہاں اس میں رکاؤ پیدا ہوا اور اس کی اقدامی حرکت، جمود سے بدلی، وہ پیچھے ہٹنا شروع کر دے گا۔ اس اقدامی حرکت کی ایک ہی عملی شکل ہے، جس کا نام امر بالمعروف و نہی عن المنکر ہے۔

یہ ہیں وہ مختلف داخلی اور خارجی پہلو جن کی بناء پر امر بالمعروف، ایمان اور اسلام اور تقویٰ ہی کا ایک قدرتی مطالبہ ہے۔

نبویؐ طریقِ کار کی شہادت:

اقامتِ دین کا یہ طریقہ اور اس کے یہ اصول تو ہمیں قرآن سے ملتے ہیں۔ اب اگر آپ قرآن کے معلم صلی اللہ علیہ وسلم کے اختیار کئے ہوئے طریق کار پر نظر ڈالیں تو پائیں گے کہ وہی اصول جو قرآن کے اندر الفاظ کے لباس میں تھے، یہاں عمل اور واقعہ کی شکل میں موجود ہیں، اور

نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ٹھیک انہی لائینوں پر ایک امت بنا کر اللہ کے دین کو قائم کیا تھا۔

آپؐ نے عرب کے اندر جس میں چپہ چپہ "دینِ" طاغوت کی آہنی گرفت میں جکڑا ہوا تھا، اپنی سعی وجہد کی ابتدا ایک کلمے سے کی۔ جس کا عملی مفہوم یہ تھا کہ انسان اپنے تمام افکار و خیالات، جذبات و میلانات، اور اپنی زندگی کے تمام مسائل و معاملات کو اس اللہ کے تابع فرمان بنا دے جس کے سوا اس زمین پر کسی کو اپنی مرضی منوانے اور اپنا حکم چلانے کا استحقاق نہیں۔ یہ نامانوس آواز جن بہرے کانوں سنی گئی اور اس کو دبانے کے لیے جن انسانیت سوز مظالم سے کام لیا گیا ان سے کوئی صاحبِ نظر ناواقف نہیں ہے۔ سیاسی حالات نے آنکھیں دکھائیں، وطنی مفاد نے آڑے آنے کی کوشش کی، وقت اور ماحول نے ساتھ دینے سے انکار کیا، مصلحتوں نے دامن پکڑا، مشکلات نے راستہ روکا۔ ہلاکتوں کا طوفان نمودار ہوا۔ مگر اللہ کے اس بندے نے اپنی آواز میں کبھی کوئی پستی نہیں آنے دی۔ اور حالاتِ زمانہ، رفتارِ واقعات اور مستقبل کے امکانی خدشات، غرض ہر چیز سے آنکھیں بند کر کے برابر اسی حقیقت کو دوسروں پر کھولتا رہا، جو خود اس پر کھل چکی تھی اور باوجود اس کے کہ وہ اپنے عقیدۂ توحید اور تصورِ زندگی میں بالکل اکیلا تھا، اس نے ایک لمحہ کے لیے بھی یہ گوارا نہ کیا کہ اس عقیدے اور تصور کو چھپائے رکھے، حالانکہ پوری دنیا اس کی زباں بندی پر کمر بستہ تھی۔ بالآخر اس دعوتِ حق نے دلوں کو مسخر کرنا شروع کیا اور، جن لوگوں کے اندر قبولِ حق کی صلاحیتیں ابھی زندہ تھیں وہ ایک ایک دو دو کر کے آپؐ کے حلقۂ اطاعت میں آنے لگے۔ آپ نے ان کے اندر سب سے پہلے خدائے واحد کی غلامی اور پرستش کا گہرا نقش بٹھایا۔ اور اصولی طور پر ان کو یہ بات سمجھا دی کہ صرف رضا اسی کی چاہو۔ کیونکہ وہی ہے جس نے تمہیں زندگی بھی عطا کی ہے اور زندگی بسر کرنے کا سامان بھی دیا ہے، اور حکم صرف اسی کا مانو، کیونکہ اس کے سوا سب تمہاری ہی طرح عاجز اور غلام ہیں۔ اس طرح اپنی مسلسل تعلیم و تربیت سے آپؐ نے ان کے دلوں کو ایک خدا کی بندگی کا ایسا گرویدہ بنا دیا کہ دینِ توحید کے دشمنوں نے اپنے ترکشِ ظلم و انتقام کے سارے تیر خالی کر دیے مگر کسی بندۂ مومن کا دل توحید کی محبت سے خالی نہ کر سکے۔

اس تعلیم و تربیت اور تزکیہ کے ساتھ ان سب لوگوں کو، جو حلقۂ اسلام میں داخل ہوتے جا رہے تھے، آپؐ ایک خاندان کے افراد کی طرح باہم جوڑتے گئے۔ یہ اخلاقی طور سے اتنا پائیدار تھا کہ بھائی بھائی کے رشتے اس کے سامنے ماند پڑ گئے اور آگے چل کر اجتماعی و سیاسی نقطۂ نگاہ سے بھی اتنا منضبط نکلا کہ آج تک دنیا کی کوئی تنظیم اس کی یکتائی کو چیلنج نہ کر سکی۔ اس سلسلے میں آپ نے اہل ایمان کو جو غیر معمولی ہدایتیں دیں وہ کسی تعارف کی محتاج نہیں۔ اور پھر، جس طرح ان ہدایتوں پر انہوں نے عمل کیا وہ بھی دنیا پر روشن ہے۔ زندگی کے پیش آمدہ مسائل اور معاملات میں، جس

موقع پر بھی منظم اجتماعیت کا کوئی رنگ پیدا کرنے کی گنجائش نظر آئی، آپؐ نے اس کو ہاتھ سے نہ جانے دیا، خواہ معاملہ کتنی ہی معمولی قسم کا کیوں نہ ہوتا۔ حد یہ ہے کہ اگر تین آدمی ایک ساتھ سفر پر بھی جاتے تو آپ کی ہدایت ہوتی کہ وہ اپنے میں سے ایک کو امیر بنالیں اور اس کی سرکردگی میں سفر کریں (اِذَا کَانَ ثَلَاثَۃٌ فِیْ سَفَرٍ فَلْیُؤمِّرُوْٓا اَحَدَ ھُمْ. (مشکوٰۃ) مسلمانوں کے ذہن میں اس طرح اجتماعیت کی اہمیت پیوست کرتے اور انہیں ایک جسم کے اعضاء کی طرح باہم جوڑتے ہوئے آپ نے اس امر کا بھی پورا اہتمام فرمایا کہ افتراق و انتشار کے عوامل اس اتحاد میں رخنے نہ پیدا کرنے پائیں۔ اس غرض سے آپ نے انہیں پوری طرح متنبہ کردیا کہ امت کا یہ اتحاد و ائتلاف عام قسم کی صرف ایک "سیاسی" ضرورت نہیں ہے بل کہ یہ ایک خالص دینی ضرورت ہے، اور اس کے بغیر وہ کام کسی طرح پورا ہی نہیں ہو سکتا جس کے لیے میری بحیثیت ایک نبی کے، اور تمہاری بحیثیت ایک امت کے بعثت ہوئی ہے۔ اللہ کی نصرت بھی تمہارے سروں پر اپنا سایہ اسی وقت ڈالے گی جب تم جماعت (ایک منظم پارٹی کی شکل میں رہو (یَدُ اللّٰہِ عَلَی الْجَمَاعَۃِ) اگر کوئی شخص اس جماعتی نظم سے بالشت بھر بھی الگ ہو گیا تو گویا اس نے اپنی گردن سے اسلام کا قلادہ نکال پھینکا (مَنْ خَرَجَ مِنَ الْجَمَاعَۃِ قِیْدَ شِبْرٍ فَقَدْ خَلَعَ رِبْقَۃَ الْاِسْلَامِ مِنْ عُنُقِہٖ اِلَّا اَنْ یُّرَاجِعَ۔ ترمذی) اور اسی علیحدگی کی حالت میں اگر وہ مر گیا تو اس کی موت جاہلیت کی موت ہوگی (مَنْ مَّاتَ وَھُوَ مُفَارِقٌ لِلْجَمَاعَۃِ مَاتَ مِیْتَۃَ الْجَاھِلِیَّۃِ (مسلم) ملت کے مقدس شیرازے پر جو شخص بھی افتراق کی قینچی چلانے کی کوشش کرے اس کی گردن مار دینا (مَنْ اَرَادَ اَنْ یُّفَرِّقَ اَمْ ھٰذِہِ الْاُمَّۃِ وَھِیَ جَمِیْعٌ فَاضْرِبُوْہُ بِالسَّیْفِ کَائِناً مَّنْ کَانَ (مسلم)

ان دونوں باتوں کے ساتھ ساتھ آپؐ اور آپؐ کے ساتھی اہلِ ایمان اللہ کے دین کو اس کے دوسرے بندوں تک پہونچانے میں برابر مصروف رہتے۔ اور جس کسی کو جاہلیت کی نجاستوں میں آلودہ پاتے اسے ان سے پاک کر کے ایک خدا کا پرستار، ایک آقائے حقیقی کا غلام اور ایک حاکم مطلق کا محکوم بنانے کی کوشش کرتے رہتے۔ جس بدی کو دیکھتے اس کو مٹانے کے درپے ہو جاتے۔ اور کفر و فساد کے جس طوفان سے رحمت حق نے انہیں نجات دی تھی اس میں دوسروں کو ڈوبتے دیکھنا انہیں کسی حال میں بھی گوارا نہ ہوتا۔ یہ دعوتی جدوجہد مکہ میں تیرہ برس تک چل پائی تھی کہ دشمنان حق کے لیے اس کی کامیابی اور روز افزوں ترقی ناقابل برداشت ہو گئی اور انہوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے قتل کی سازش کر کے اس دعوت کو فنا کر دینا چاہا۔ اس لیے آپؐ نے اور آپؐ کے سچے پیرووں نے اپنے عزیز وطن کو خیرباد کہہ دیا اور مدینہ جاکر اسے اپنے مشن کا مرکز بنایا۔ جب کفار نے وہاں بھی چین نہ لینے دیا اور اِدھر اہلِ ایمان کی ایک منظم جمعیت

بھی فراہم ہو چکی تھی، تو اب بدی کی جڑیں کاٹ کر رکھ دینے اور نیکی اور انصاف کی بقا کے لیے آخری شکل اختیار کی گئی۔ یعنی منکر کو مٹا دینے کے لیے دل اور زبان کی کوششوں کے علاوہ اب "ہاتھ" کی بھی کوششیں شروع کر دی گئیں۔ ایک مدت تک تو طاغوتی طاقتیں خود بڑھ بڑھ کر مدینہ پر حملہ آور ہوتی رہیں۔ اور آپؐ اور آپؐ کے ساتھی صرف مدافعت کرتے رہے۔ اس مدافعت میں انہوں نے جان و مال کی ہر ممکن قربانی دے کر حق کی شہادت ادا کی یہاں تک کہ اس مدافعانہ پالیسی ہی کے دوران کفر کی شوکت ٹوٹنے لگی۔ اور آخر کار عرب میں طاغوت کا علم سرنگوں ہو گیا۔ اسے دیکھ کر مسلمانوں کا دل اللہ کی تائید و نصرت پر شکر اور مسرت کے جذبات سے بھر گیا۔ مگر اس کے باوجود ان کے لیے اپنی کمریں کھول لینے کا ابھی کوئی موقعہ نہ تھا۔ اس لیے ان کی سواریوں کے کجاوے اسی طرح بندھے کے بندھے رہے۔ کیونکہ اگرچہ عرب میں بدی نے ہتھیار ڈال دیے تھے، مگر اس کے باہر ہر طرف اس کی حکمرانی پوری شان کے ساتھ قائم تھی اور مسلمان اپنے اس فرض کو بھول نہیں سکتے تھے کہ منکر کو مٹا دینا چاہیے خواہ وہ کہیں بھی ہو۔

ایک غلط فہمی کا ازالہ :

ان تفصیلات سے یہ حقیقت اچھی طرح روشن ہو جاتی ہے کہ قرآن مجید ہو یا سنتِ رسول، ہر ایک سے اقامتِ دین کے یہی تین بنیادی اصول معلوم اور متعین ہوتے ہیں۔ اس لیے اس فرض کو ادا نہیں کیا جا سکتا جب تک کہ ان تینوں اصولوں پر پورے عزم و استقلال کے ساتھ عمل نہ کیا جائے۔ لیکن اس سلسلے میں یہ غلط فہمی نہ ہونی چاہیے کہ اس عمل درآمد میں کوئی ایسی زمانی ترتیب ہے جس کی رو سے ضروری ہے کہ جب پہلے اصول پر پوری طرح عمل ہو لے تب دوسرے کی ابتداء کی جائے اور جب دوسرے اصول کی بھی پیروی کا حق ادا ہو جائے تب کہیں جا کر تیسرے کا نام لیا جائے۔ اس کے برعکس صحیح بات یہ ہے کہ ان تینوں اصولوں پر عمل بیک وقت شروع ہونا چاہیے۔ اور اگر اس عظیم مہم کے شروع کرنے سے پہلے کسی بات کی ضرورت ہے تو صرف اس بات کی ہے کہ ذہن کی پوری یکسوئی اور دل کی سچی شہادت کے ساتھ انسان کا لا الہ الا اللہ اور محمد رسول اللہ پر ایمان ہو۔ اس یقین و اقرار کے بعد جب ایک شخص یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا سے مخاطب کئے جانے والے گروہ میں داخل ہو گیا، تو قرآن ایک ہی ساتھ اس کے سامنے اپنے یہ تینوں اصول رکھ دیتا ہے، اور اس کے لیے ضروری ہو جاتا ہے کہ اپنے حالات اور اپنی استطاعت کے مطابق ان پر عمل کرے۔

اس بات کی سب سے بڑی دلیل، کہ ان اصولوں پر عمل ایک ساتھ ہونا چاہیے، یہ ہے کہ ان میں عملی پیروی کے لحاظ سے تفریق کرنا سرے سے ممکن ہی نہیں۔ کیونکہ دوسرے اور تیسرے

اصول اپنی حقیقت کے اعتبار سے اپنی ایسی کوئی مستقل بالذات نوعیت رکھتے ہی نہیں کہ ان کے وجود میں پہلے اصول کا کوئی دخل نہ ہو۔ اس کے بخلاف حقیقت یہ ہے کہ وہ اسی اصل کی شاخیں ہیں، یا کم از کم یہ کہ اس کے راست تقاضوں میں شامل ہیں۔ اور انہیں اختیار کئے بغیر خود اس پر عمل کا حق بھی ادا نہیں ہو سکتا۔ اس طرح دوسرے اور تیسرے نکتوں پر عمل پیرا ہونا در اصل پہلے ہی نکتے کے اتباع کو مکمل کرنا ہے۔

اس دعوے کی صحت معلوم کرنے کے لیے اس کے علاوہ اور کسی بحث کی ضرورت نہیں کہ تقویٰ کے صحیح اور کامل عملی مفہوم کو اچھی طرح ذہن نشین کر لیا جائے جسے اوپر کی سطروں میں ابھی جلد ہی واضح کیا جا چکا ہے۔ یعنی یہ کہ اللہ تعالیٰ کے نازل کئے ہوئے سارے احکام کی ٹھیک ٹھیک پیروی کا اور اس کی قائم کی ہوئی جملہ حدود کی پابندی کا نام تقویٰ ہے۔ اس بات کو اگر ذہن میں پوری طرح متحضر کر لیا جائے تو یہ حقیقت آپ سے آپ روشن دکھائی دینے لگے گی کہ اقامتِ دین کے آخری دو اصول فی الواقع پہلے ہی اصول کے اجزاء یا اس کے قریب ترین تقاضے ہیں، اور یہ اس لیے کہ اپنے نصب العین کی خاطر تمام اہل ایمان کا باہم متحد و منظم ہونا اور امر بالمعروف کو اپنی ایمانی زندگی کا شعار بنائے رکھنا بھی، کتاب و سنت کی رو سے، انہی احکام و حدود میں داخل ہے، جن کی پیروی اور پابندی کا نام تقویٰ ہے۔ چنانچہ پہلے باہمی اتحاد کے بارے میں چند آیتوں کی شہادت سنیئے:۔

یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ وَكُوْنُوْا مَعَ الصّٰدِقِیْنَ (التوبۃ:۱۱۹)

اے ایمان لانے والو! اللہ کا تقویٰ اختیار کرو اور سچے مومنوں کے ساتھ رہو۔

اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ اِخْوَةٌ فَاَصْلِحُوْا بَیْنَ اَخَوَیْكُمْ وَاتَّقُوا اللّٰهَ لَعَلَّكُمْ تُرْحَمُوْنَ (الحجرات:۱۰)

اہل ایمان آپس میں بھائی ہیں، سو اپنے دو بھائیوں کے درمیان (اختلاف و عناد پیدا ہو جانے کی صورت میں) صلح کرا دو۔ اور اللہ کا تقویٰ اختیار کرو، تاکہ اس کی رحمت سے سرفراز ہو سکو۔

وَاتَّقُوْهُ وَاَقِیْمُوا الصَّلٰوةَ وَلَا تَكُوْنُوْا مِنَ الْمُشْرِكِیْنَ مِنَ الَّذِیْنَ فَرَّقُوْا دِیْنَهُمْ وَكَانُوْا شِیَعًا كُلُّ حِزْبٍ بِمَا لَدَیْهِمْ فَرِحُوْنَ. (الروم:۳۱۔۳۲)

اس کا تقویٰ اختیار کرو، نماز قائم کرو اور مشرکوں میں سے نہ بنو، یعنی ان لوگوں میں، جنہوں نے اپنے دین کو ٹکڑے ٹکڑے کر دیا اور مختلف ٹولیوں میں بٹ کر رہ گئے اور اب ہر گروہ اپنے اپنے خیالات و افکار میں مگن ہے۔

ان آیتوں میں سے پہلی آیت کے اندر سچے مومنوں سے جڑ کر رہنے کو، اور دوسری کے اندر دو باہم پھٹے ہوئے مومن دلوں کے دوبارہ جوڑ دینے کو "اتقا" سے تعبیر کیا گیا ہے، اور تیسری آیت میں ایک طرف تو ملی انتشار کو شرک کا خلاصہ قرار دیا گیا ہے، گویا یہ کہا گیا ہے کہ ملی اتحاد توحید کا خاصہ ہے۔ دوسری طرف اس میں توحید کے ماننے والوں سے تقویٰ اور اقامتِ نماز کا مطالبہ کیا گیا ہے۔ ان دونوں چیزوں میں سے ایک (تقویٰ) تو توحید کا باطن ہے اور دوسرا (نماز) اس کا ظاہر ہے۔ یہ سب باتیں اس امر پر صاف دلالت کرتی ہیں کہ ملی انتشار، تقویٰ اور نماز دونوں کی روح کے یکسر منافی ہے۔ جماعتی اتحاد اور تنظیم کی ضروری اور اہم ترین علامتوں میں سے ایک علامت ہے، اور اسکا موجود نہ ہونا صحیح تقویٰ کے نہ ہونے کا ثبوت ہے۔

اس کے بعد کچھ دوسرے نصوص ملاحظہ ہوں جن میں اسی طرح امر بالمعروف کو بھی صلاح و تقویٰ کا کام قرار دیا گیا۔

(۱) يُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَيَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَيُسَارِعُوْنَ فِي الْخَيْرَاتِ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌ بِالْمُتَّقِيْنَ (آل عمران:۔ ۱۱۴،۱۱۵)

یہ لوگ اللہ اور یوم آخرت پر ایمان رکھتے ہیں، معروف کا حکم دیتے ہیں، منکر سے روکتے ہیں، اور اچھے کاموں میں تیزگام رہتے ہیں۔ اور اللہ متقیوں سے واقف ہے۔

(۲) يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا قَاتِلُوا الَّذِيْنَ يَلُوْنَكُمْ مِنَ الْكُفَّارِ وَلْيَجِدُوْا فِيْكُمْ غِلْظَةً وَّاعْلَمُوْا اَنَّ اللّٰهَ مَعَ الْمُتَّقِيْنَ . (التوبة:۱۳۲)

اے ایمان والو! ان کافروں سے لڑو جو تمہارے قریب میں ہیں، اور چاہیے کہ وہ تمہارے اندر سختی پائیں۔ یاد رکھو اللہ متقیوں کے ساتھ ہے۔

پہلی آیت میں مطلقاً ہر امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کو متقیوں کی صفات اور تقویٰ کے اعمال میں شمار کیا گیا ہے، اور دوسری میں نہی عن المنکر کی ایک خاص شکل، یعنی دین کے دشمنوں سے لڑنے کو تقویٰ سے موسوم کیا گیا ہے۔

اب ایک اور آیت سنیے، جو ان دونوں حقیقتوں کی جامع ہے:۔

وَالْمُؤْمِنُوْنَ وَالْمُؤْمِنَاتُ بَعْضُهُمْ اَوْلِيَآءُ بَعْضٍ يَّاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ (التوبة:۷۱)

اور مومن مرد اور مومن عورتیں سب آپس میں ایک دوسرے کے "ولی" ہیں نیکی کا حکم دیتے ہیں اور بدی سے روکتے ہیں۔

اس آیت نے ملی اتحاد اور امر بالمعروف، دونوں چیزوں کو ایمان کے اعمال اور مقتضیات کی حیثیت سے ایک ہی ساتھ جمع کر دیا ہے۔

ان تمام آیات کی روشنی میں اس وہم کی تاریکی کے لیے کوئی گنجائش باقی نہیں رہتی کہ جب تک اقامتِ دین کے پہلے نکتہ پر پورا پورا عمل نہ ہو لے اور انسان کا باطن نورِ تقویٰ سے اچھی طرح جگمگانہ جائے اس وقت تک اس کے لیے دوسرے اور تیسرے نکتوں کی طرف توجہ کرنا صحیح نہیں، لیکن افسوس ہے کہ یہ خیال آج ایک واقعہ بن کر ہمارے بے شمار ذہنوں پر مسلط ہے اور اس نے دین کی خدمت و نصرت کے بارے میں ہمارے فکر وعمل کے زاویے بدل کر رکھ دیے ہیں۔ نصرتِ دین کی جو گاڑی تین پہیوں پر چلائی جانی چاہیے تھی، اور جو ان تین پہیوں کے بغیر چل ہی نہیں سکتی۔ اسے صرف ایک پہیے سے چلانے کی عجیب و غریب کوشش ہو رہی ہے، جس کا نتیجہ قدرتی طور پر یہ نکل رہا ہے کہ یہ گاڑی ایک انچ بھی آگے بڑھنے کے بجائے اپنی جگہ کھڑی زمین میں کچھ دھنستی ہی جا رہی ہے۔ دراصل یہ خیال ایک زبردست حجاب ہے، جو ہمارے اکثر نیکوکار کی بصیرتوں پر خاص طور پڑا ہوا ہے۔ اس کا ظاہری پہلو یقیناً بڑا دین دارانہ دکھائی دیتا ہے مگر حقیقتاً یہ نظریہ اسلامی طرزِ فکر سے قطعاً کوئی لگاؤ نہیں رکھتا۔ جب ایک شخص سچا متقی بن ہی اس وقت سکتا ہے جب وہ اہل ایمان گروہ سے مربوط بھی رہے اور اپنی بساط بھر امر بالمعروف کا فرض بھی انجام دیتا رہے، تو یہ کہنا کتنا بے معنی ہو گا کہ آدمی پہلے کامل اور معیاری متقی بن لے تب کہیں جا کر ملی اتحاد و تنظیم اور امر بالمعروف کی مہمات کا آغاز کرے۔ ان تینوں نکات کی مثال تو بالکل ایک درخت کے اجزا کی سی ہے جس طرح بیج سے جوں ہی ننھا سا پودا اگتا ہے اس میں جڑ، تنے اور پتے، سب کی تخلیق ہو جاتی ہے، اور یہ تینوں چیزیں ایک ساتھ نمو پاتی اور پروان چڑھتی رہتی ہیں۔ ایسا نہیں ہوتا کہ بیج سے جڑ نکل کر خوب موٹی تازی ہو لیتی ہے تب اس میں سے تنہ نکلتا ہے اور جب تنہ اپنی پوری بالیدگی کی حد کو پہنچ جاتا ہے تب جا کر اس میں سے پتیاں نکلنی شروع ہوتی ہیں۔ اسی طرح قلب انسانی میں جب ایمان کا بیج جگہ پکڑتا ہے تو ایسا نہیں ہوتا کہ اس سے صرف تقویٰ کی جڑ ہی نکلتی ہو اور نکل کر ایک مدت دراز تک خوب موٹی تازی اور مضبوط ہوتی رہتی ہو۔ تب جا کر اتحاد ملی اور امر بالمعروف کا موقع آتا ہو، بل کہ ہوتا یہ ہے کہ ساتھ ہی ساتھ اس سے ملی اتحاد اور امر بالمعروف کی شاخیں اور پتیاں بھی نکلنے لگتی ہیں۔ پھر زمین کی زرخیزی اور بیج کی عمدگی کے مطابق تقویٰ کی جڑ جس قدر گہری اترتی جاتی ہے اسی قدر شاخیں اور پتیاں بھی بلند و بالا اور سرسبز و شاداب ہوتی جاتی ہیں۔ یہاں تک کہ اَصْلُهَا ثَابِتٌ وَّ فَرْعُهَا فِي السَّمَاءِ کا منظر سامنے آ جاتا ہے۔